

حساب

رات کی رم زوہ (دھشت ناک) جھولی میں
دیو قامت مجسمہ نفس کو پھاند کر فلک پاش قہقہے لگا رہا
تھا۔

رم زوہ شب فلک تا خاک نام نہاد انسانوں کے چار
اطراف رقصاں تھی۔

اتر کر گھوم رہی تھی۔

گھوم کر لپٹ رہی تھی۔

اور بجھ کر بھل کر بھڑک رہی تھی۔

کیونکہ اسی رات عاصروہ کی چیخ گھر کے کونے کونے
میں پھیل کر کائنات کے ذرے ذرے کو گواہ بنا رہا تھا
لاری تھی۔

کیونکہ یہ عاصروہی تھی جو فیروزہ کی اماں تھی۔

اور یہی عاصروہ تھی جو صاحب اولاد نہ ہو سکی تھی۔

کیونکہ وہ شادی شدہ نہ ہو سکی تھی۔

عافہ نے اپنی لاڈلی اکلوتی بیٹی کے منہ سے خون کی
ایک پتلی لیکر نگتے دیکھی تو اس کے اندر ایک دم سے
دھشت کا ریل گاڑا کوند پھاند کر اسے پیچھے بہت پیچھے کی
طرف دھکیلنے لگا۔

جیسے دلدل کا سوتا پھوٹا ہوا۔ جو اتنی آہستگی

سے اتنے توازن سے گہرے پاتال میں لے جاتی ہے

کہ دھنسنے والے کو خبر ہی نہیں ہوتی کہ وہ اندر ہی اندر

دھنس رہا ہے یا دلدل کو اپنے ساتھ لیے اوپر اٹھ رہا

ہے۔

فیروزہ ہوش تھی۔ بے ہوش تھی یا۔ یا۔

اس یا کے آگے بہت کچھ تھا۔ اس یا کے پیچھے بھی

بہت کچھ تھا۔

اس کی بیٹی آنکھیں نہیں کھول رہی تھی۔
بھائیوں کی اکلوتی بہن۔ فیروزہ۔ لیکن تین بیٹوں کی
اکلوتی ماں کی آنکھیں کھل سی گئی ہیں۔ اسی بیٹی کی
اس کے پیروں کی طرف کھڑی ہے ساکت خاموش
اسی بیٹی کی اماں جانی اس کے سرہانے بیٹھی باؤلی سی
ہو رہی ہے۔

”فیروزہ۔“ اس کی اماں جانی نے چیخ ماری۔

”آنکھیں۔۔۔ بھابھی! جلدی فون کریں ڈاکٹر کو۔“

دیکھیے اسے کیا ہوا ہے، یہ ایسے کیسے اسے کیا ہوا ہے
بھابھی۔۔۔ فیروزہ! ایک پاگل دو سری پاگل کو جھنڈا
رہی تھی۔

تیسرا صحیح الدماغ بشران دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

خاموش۔۔۔ جواب الجواب۔

خون کی ایک لکیر اس کی ناک سے بھی نکل رہی

تھی۔

نقص کی ایک لکیر اس کے نفس پر بھی پھری تھی۔

فیروزہ کے دماغ کی رو یقیناً ”کل رات غلط سمت

بھاگی دوڑی ہوگی۔“

غلطی کی طرف۔۔۔ نا سمجھی کی طرف۔۔۔ لاعلمی

سے۔۔۔

اس کی ماما کی رو بھی بھاگی دوڑی تھی۔ غلطی۔

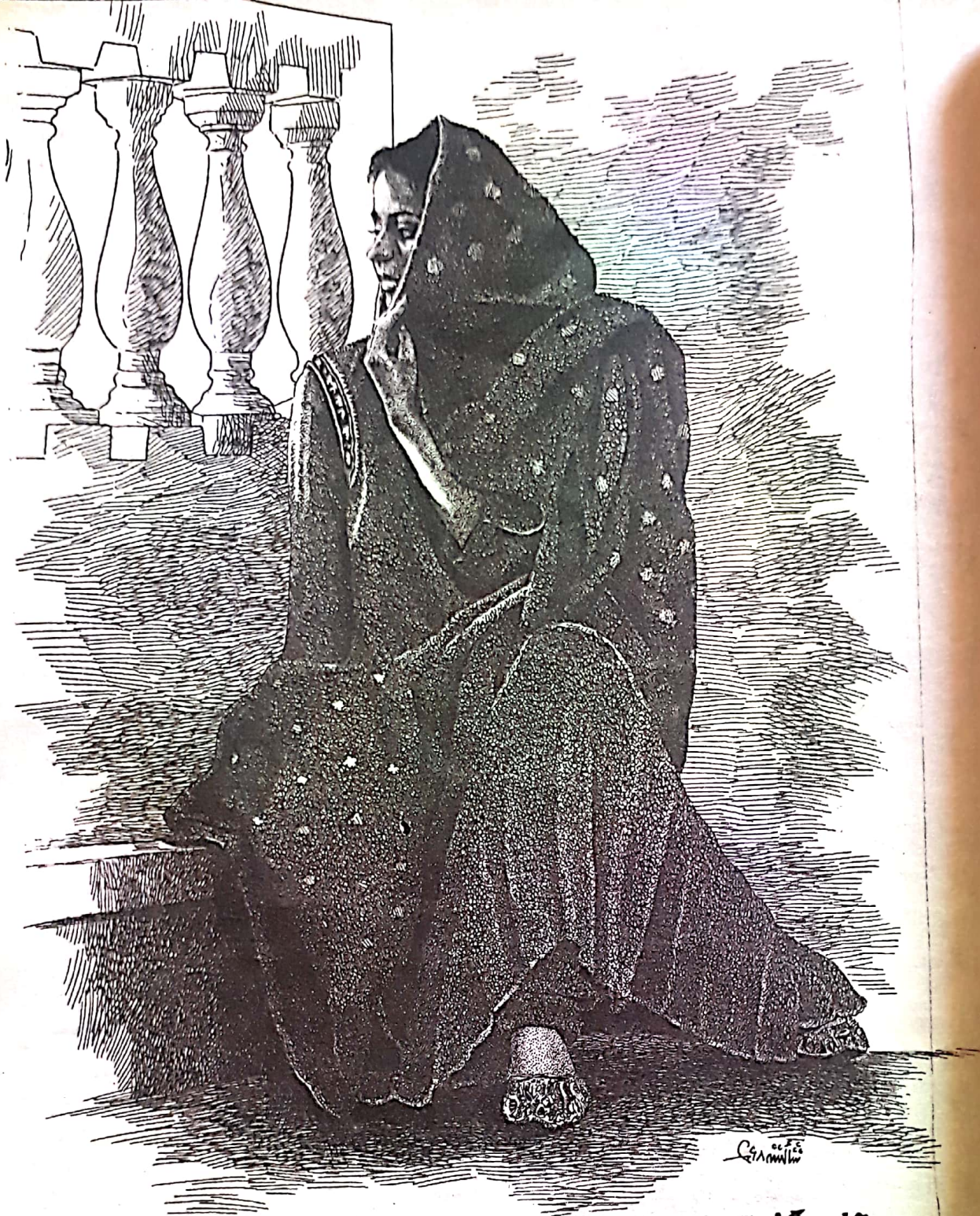
غلطی۔ گناہ کی طرف۔

”فیروزہ!“ ماں اس کا سر گود میں رکھ کر اسے چوم

رہی تھی، اسے مار رہی تھی، اس کے کانوں کے پاس

چلا رہی تھی۔

”فیروزہ!“ ماما جانی جواب الجواب کھڑی دلدل ہوتی



شیطان کیوں بنا؟ پختہ عمر کی بن بیاہی عاصہ فیروزہ کا سر
گود میں رکھے تڑپ رہی ہے۔ اس کی بیٹی اور اپنی بیٹی
جیسی فیروزہ کے لیے۔

پختہ عمر کی عاصہ کبھی چھوٹی عمر کی فیروزہ تھی۔ جب
وہ بیس سال کی تھی تب۔ جب وہ اس کی اکلوتی
بھابھی بنی تھی تب سے پہلے خاص کر۔
وہ گہرے سانولے رنگ کی تھی۔ اور یتیم تھی۔
اپنے بڑے کنبے کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے اس کی اتنی عمر

زمین میں دھنس دھنس گئی۔ اپنی بیٹی سے نظریں
ہٹاتے بچاتے، اس کی نظریں عاصہ تک آکر مجسم
انجام بن چکی تھیں۔

عافیہ عاصہ پر اپنی نظریں گاڑے اندر ہی اندر
دھنس رہی تھی۔ اپنی بیٹی کے سرہانے سے پھوٹی
موت کے پرندے کی پھر پھر ہٹا اسے دہلا رہی تھی۔
پر اب دیر ہو گئی تھی۔ اعمال کے پرندے کے پروں
پر اس نے سیاہی پھیر دی تھی۔ حضرت انسان ملا متی

دونوں گاؤں کے رہائشی سیدھے سادہ انسان
ایڈمیشن منتھ کا پتا تھا نہ شہری اسکولوں کے قواعد
وضو اہل کا۔
”اسے اسکول داخل کروادو عافیہ!“ ایک نوجوان
نے کہا جب بار بار کہنے لگا تو ناچار عافیہ اسے اسکول
گئی، پرنسپل نے عاصروہ کے سامنے کہا۔
”ایڈمیشن تو نہیں ہو سکتا۔“
عاصروہ کو کیا بات سمجھ میں آئی عافیہ نے ہی سمجھا
کہ پرنسپل صاحبہ کہہ رہی ہیں کہ تم گاؤں کے اسکول
سے پڑھ کر آئی ہونا تو گاؤں کی پڑھائی پہل نہیں
چلتی۔ انہیں تمہارا ٹیسٹ لینا ہو گا اور دو میسٹر
بعد نہیں پورے دو سال بعد ہو گا۔
”دو سال بعد بھابھی۔ دو سال مطلب؟“
”اگلے سے اگلے سال ہو گا ٹیسٹ۔“
”میری تو تین جماعتیں رہ جائیں گی بھابھی۔“
”میں کیا کر سکتی ہوں۔ بس اب یہی ہونا ہے۔“
یہاں۔

عاصروہ پھر سے دو سال کے لیے انتظار میں جا پڑا۔
فرقان سے کہہ دیا پرنسپل نے انگلش میں کچھ سہل
جواب کیے تھے، عاصروہ نے ان کے جواب نہ دیے۔
انہوں نے کہا، فی الحال گھر میں پڑھاؤ اور عاصروہ
نہ پوچھنا۔ اس کا دل چھوٹا ہو گا۔
فرقان کتابیں لایا کہ عاصروہ گھر میں رہ کر پڑھو۔
دونوں بعد عافیہ نے کتابیں اٹھا کر رکھ دیں کہ ”جہاں
جاذب پھاڑ دے گا جب اسکول جاو گی تو نکل لیتا۔“
عافیہ آفس جاتی رہی۔ وہ جاذب کو سنبھالتی۔
فیڈر بناتی، اسے کھلاتی، بھلاتی اور تھک کر اس کے
ساتھ ہی سو جاتی۔
اگلے سال حماد آگیا۔ عاصروہ کے پاس اپنی
ہو گئے۔ عافیہ اپنے میکے والوں کے سامنے خرچ
کرتی۔

”میرے بچے میرے پاس نہیں آتے اور عاصروہ
پاس سے نہیں جاتے خیر سے بہت پیار کرتی ہے۔
پھوپھو جانی ان سے۔ ہے کوئی عاصروہ جیسی بھابی۔“

فرقان پیرول پمپ پر نوکری کرنے لگا اور عافیہ پھر
سے آفس جانے لگی۔ گاؤں میں عاصروہ باقاعدگی سے
اسکول جاتی تھی۔ گاؤں چھوڑا تو اسکول بھی چھوڑا۔
عافیہ نے کہا کہ وہ اگلے سال اس کا اسکول میں داخلہ
کروادے گی، لیکن اگلے سال کیا کسی بھی سیال اس کا
داخلہ نہ ہو سکا کیونکہ اس کی بھابھی سچ اور سچ تھی اور وہ
بے چاری سی عاصروہ اگر وہ اسکول جاتی تو گھر کے کام کون
کرتا۔ عاصروہ ہی صبح ان دونوں کو ناشتا بنا کر دیتی تھی۔
برتن، صفائی، دوپہر کا کھانا وہ سب بڑی پھرتی سے
کرتی۔ بن ماں کے پلی تھی۔ چودہ سال کی عمر سے ہی
اسے سب کرنا آتا تھا۔

عافیہ آفس سے تھکی آتی تو آکر سو جاتی۔ شام میں
عاصروہ سبزی بنا دیتی، دل چاہتا تو عافیہ سالن بنالیتی ورنہ
سالن، آٹا، دہلی عاصروہ سب خاموشی سے کئے جاتی۔
اس ”سب کرنے میں“ اسے اسکول بھیجنے کی غلطی
کون کرتا؟

”بھابھی سال گزر گیا؟“ وہ آئے دن بڑی آس سے
سوال کرتی۔
”نہیں۔“ وہ جھٹکتی۔

مجھے۔

نہ وہ کئی نہ وہ پڑھی۔ وہ بڑی ہوتی گئی۔ گھر اور بچے سنبھالتی رہی۔ تین بھتیجیوں کی پھوپھو جانی بن گئی۔ چوبیس سال کی ہو گئی۔ فرقان قطر چلا گیا۔ عافیہ نے ہی بھیجا۔ اسے بڑا گھر چاہیے تھا۔ گاڑی لینی تھی اسے۔



نفس کی کلائی تھامے کاش کبھی تو انسان ذرا کی ذرا رک کر دیکھے کہ وہ نفس کے ساتھ کس راستے پر بھاگتا چلا جا رہا ہے۔

کبھی ایک لحظے کے لیے وہ سر جھکا کر اپنے پیروں کے نشانات پر تو غور کرے کہ وہ کس پاتال کی طرف جا رہے ہیں۔

کبھی تو وہ سر اٹھا کر آسمان والے کو دیکھے اور اس کی مانے۔

”پر انسان گھائے کا سودا ہی کرنے والوں میں سے ہے۔“

اس کا سودا ”عاصرہ“ بستر پر آہ لگا کر رہی ہے۔ اس کا گھانا ”فیروزہ بستر پر بے حس ہوتا جا رہا ہے۔ اور کبھی تو انسان اپنے ”سودے“ اور اپنے ”گھائے“ کے بارے میں سوچے۔ کبھی تو۔

وہ آفس جاتی۔ ورنہ سیر پالے کرتی رہتی۔ یہاں جاؤں جاں جاں۔ گھر کی طرف سے مکمل بے فکری۔ اس کی زندگی اب ہی تو سہل ہوئی تھی، زندگی سے اب ہی تو اس نے لطف لینا شروع کیا تھا۔ پہلے ذمہ داریاں تھیں اور شادی نہ ہو سکنے کا خوف۔ اب جو ذمہ داریاں تھیں، وہ عاصرہ کی تھیں۔ اس کے پاس پیسے تھے۔ اچھے ملبوسات تھے۔ وہ زیورات پہن کر گھنٹوں باتیں کرتی رہتی کافی کامگاہ تھ میں لے کر، اسے پروا تک نہ ہوتی کہ اس کے بچے سوئے ہیں یا نہیں انہوں نے کھانا کھایا ہے ٹھیک سے کہ نہیں۔

فرقان کے فون پر فون آتے۔
”کوئی رشتہ دیکھا۔ کوئی رشتہ آیا؟“

کسی اور کے پاس۔“

عاصرہ اپنی تعریف سن کر پھولے نہ ساتی۔ خاص کر شہری کھانے کھانے والوں اور ٹانگ پر ٹانگ، جاکر بڑے بڑے صوفوں پر بیٹھنے والوں کے سامنے تو اسے لگا کہ اس کی زندگی کا حاصل وصول ہو گیا۔

وہ اور بھاگ بھاگ کر جاذب اور حماد کے کام کرتی۔ ماسی آتی، گھر کی صفائی کر جاتی اور وہ دونوں بچوں کو دیکھتی۔

دو سال گزرے۔ تین بھی گزر گئے۔ درمیان میں جب جب وہ اسکول کا سوال کرتی بھا بھی کچھ یوں جواب دیتی اسے۔

”عاصرہ! یہ سرکاری اسکولوں کے استاد بہت مارتے ہیں۔ میری اماں کے ادھر ساتھ والی خالہ کی نواسی کے بانو کی بیٹی تو زردی۔ یہ شرے نایہاں یہ سب ہوتا ہے۔ کوئی کسی کو کچھ کہہ نہیں سکتا۔“

”یہ جو اسکول ہوتے ہیں نا گندی سندی زمینوں پر بناتے ہیں۔ خاص کر قبرستانوں کی زمین پر۔ اور یہاں جنوں، چڑیلوں کے سائے ہوتے ہیں۔ ابھی پچھلے مہینے اخبار میں خبر آئی کہ ایک بچی کی لاش ملی اسکول کے ہاتھ روم سے۔ ایک بچی چھت سے گر کر اپنی دونوں ٹانگیں تڑوا بیٹھی۔ ایک کا اندھیرے میں کسی بلانے لگا دیا۔ تڑپ تڑپ کر بچی مر گئی۔ اگلے دن لاش اسکول کے بند گٹر سے ملی۔ میرا تو دل کلپ جاتا ہے یہ سوچ کر کہ تو بھی اسکول جائے گی۔ میرے بس میں ہو تو کبھی اپنی پیاری عاصرہ کو اسکول نہ جانے دوں۔ یہ شہروں کے اسکول ان سے تو موت اچھی ہے۔“

بے چاری عاصرہ سہم سہم جاتی۔

فرقان کو یاد آتا تو کہتا۔

”عاصی! تو کیوں نہیں جاتی اسکول۔ کتنی بار کہہ چکا ہوں اپنی بھابھی کے ساتھ جا اور داخلہ لے لے۔“

وہ صاف کہنے لگی۔

”مجھے نہیں جانا بھائی جان! اسکول۔ نہیں پڑھنا۔“

”دیکھا تھا۔ عافیہ کو پسند بھی کر گئے۔ لڑکا چری لکلا۔“
 ”لڑکے کی دکان ہے، اپنی الیکٹرونکس کی۔ لڑکا شراب پیتا ہے۔ کردار کبھی بہت خراب ہے۔“
 ”مجھے رشتے کہاں ملتے ہیں اتنی جلدی۔ دیکھ تو رہی ہوں۔ ہزار لوگوں کو کہہ رکھا ہے اور کیا کروں۔“
 سال بعد فرقان آیا۔ رشتے والی کو بلایا۔ عافیہ نے اسی رشتے والی کو الگ سے بلایا۔ ”کہنا لڑکی بی اے پاس ہے۔“

”لیکن لڑکی کا بھائی تو کہہ رہا ہے کہ یہ چھ سات پاس ہے۔“

”جو کہا ہے وہ کرو آپا! بس یہی کہہ کر رشتہ دیکھنا۔“
 آپا بی اے پاس کا کہہ کر بڑھے لکھے خاندان کو لے آئی۔ لڑکی انہیں پسند آگئی۔ بات چلی ہو گئی۔ بعد ازاں انہیں کہیں سے پتا چلا کہ لڑکی پانچ پاس بھی نہیں۔ متنگی ٹوٹ گئی۔ جب متنگی ہوئی تو فرقان واپس چلا گیا کہ واپسی پر شادی ہوگی۔ وہ وہاں اچھے خاندان کو دینے کے لیے جہیز اکٹھا کرتا رہا۔ یہاں رشتے آتے رہے۔ بنتے گئے۔ ٹوٹے گئے۔ کبھی لڑکا جواری نکل آتا۔ کبھی شرابی، کوئی شادی شدہ ہوتا۔ کسی کے چار بچے ہوتے۔

گاہے بگا ہے۔ بھابھی عافیہ مند عاصہ کو پاس بٹھائے سچ گپ کرتی رہتی۔

”میرے بس میں ہوتا تو کبھی شادی نہ کرتی۔ ابھی بھی کہاں کر رہی تھی میری اماں نے زبردستی کر دی۔“
 ”کیوں بھابھی؟“

”ذالالت ہے عاصی۔ نری ذالالت۔ بد دعا ہے عورت کو شادی۔ پنجرہ ہے جس میں دم گھٹتا ہے، نہ عورت مرتی ہے، نہ جیتی ہے، لعنت کا طوق ہے یہ۔“
 ”ہائے بھابھی! کیوں؟“

”جوئی کی نوک پر رکھتا ہے شوہر۔“
 ”فرقان بھائی جان تو بہت اچھے ہیں بھابھی!“
 ”مجھ سے پوچھ، کتنے اچھے ہیں۔ گھونگھٹ

اٹھاتے ہی تیرے بھائی نے میرے منہ پر تھوک دیا تھا۔ کہتا، دوزخی، لعنتی، پھیل۔ اور کیا بتاؤں۔ کیا نہیں کہا مجھے۔ ہزار بار دھتکارا ہے مجھے۔ کہتا ہے میں ہوں ہی اسی لائق۔ میرا رنگ۔ میری شکل سب خدا نے ہی بنائی ہے ناعاصی۔ پر ان مردوں کو کون سمجھائے۔ انہیں تو حوریں چاہئیں۔ اسی لیے تو ہر دوسری عورت کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ مجھے تو تیرے لیے ڈر لگتا ہے عاصی! تیری تو آنکھ پر سورج گرہن بھی ہے۔ یہ اتنا بڑا سیاہ دھبہ۔ تیرا شوہر نجانے کیسے کیسے تھو کے گا تیرے پر۔“

عاصی سیاہ دھبے جیسی سیاہ ہو جاتی۔
 ”فرقان بھائی جان۔ وہ تو ایسے نہیں تھے بھابھی!“
 ”وہ بھائی ایسا نہیں۔ باپ ایسا نہیں، پر شوہر ایسا ہی ہے عاصی۔! سارے شوہر ایسے ہی ہوتے ہیں؟“
 ”سارے بھابھی؟“

”ہاں سارے۔ میری چھوٹی بہن جس کی شادی میں تم بھی گئی تھیں۔ شادی کے پہلے ہی دن شوہر نے چٹیا پکڑ کر سردیوار سے دے مارا۔ کئی دن ہوش میں نہیں آئی تھی۔ اماں تو بات ہی چھپاتی رہیں۔“
 ”بھابھی۔ رخشدہ آپا تو اتنی اچھی ہیں۔ اتنی خوب صورت۔“

”یہ مرد ذات ایسی ہی ہوتی ہے۔ اس کے شوہر نے کہا۔ میرے جوتے صاف کر دو۔ اس نے صرف اتنا کہا۔ ابھی تھوڑی دیر میں کر دیتی ہوں۔ کہتا فوراً“
 ”کیوں نہ کیے۔ اتنا مارا اتنا مارا۔ کہ کیا بتاؤں۔ اور کیا کیا بتاؤں تجھے۔ مجھے تو وحشت ہوتی ہے۔“
 ”وحشت عاصہ کو بھی ہونے لگتی۔ اس کا دم سا گھٹنے لگتا۔ سالوں سے بھائی کے گھیر کی چار دیواری میں ہی رہتی رہی تھی۔ نہ دنیا دیکھی تھی، نہ دنیا داری۔ اس کی چیت بھی بھابھی تھی پٹ بھی۔ وہ کیسے رماز (پہلی کہنے والی) بھابھی کی رمز جان جاتی۔“
 ”سم سم سم جاتی۔ دہلی دہلی رہتی۔“

گاہے بگا ہے بھابھی تیر چھوڑتی رہتی۔
 ”میرنی کو لیگ کی بہن کی شادی ہوئی تھی پچھلے

میں نے خداداد شمن کو ایسے دن نہ دکھائے جو اس کی بہن نے دیکھنے سے بچنے کے اندر اندر طلاق دے دی۔ طلاق سے پہلے کمرہ بند کر کے چمڑے کی بیلٹ سے مارا۔ کتنا تھابہ کردار ہے۔

دھوپ کرنے لگا۔
”یہ دیکھ میرے بھائی نے رات مجھے مارا ہے۔“
کسی رات میں وہ غسل خانے میں پھسل گئی تھی۔
”کیوں مارا بھائی نے؟“ وہ نئے سرے سے سہم گئی۔

”وہی شک۔ رات کو اپنے بھائی سے فون پر بات کر رہی تھی۔ کتنا ہے کہ کوئی اور تھا۔ میرا سردیوار پر دے مارا۔“

”مجھ پر بھی کرتے ہیں شک؟“
”تو تو بہن ہے۔ تیرا شوہر کرے گا تجھ پر۔ لکھ لے۔ ہائے میرا تو جوڑو جوڑ دکھ رہا ہے۔“
”میں شادی ہی نہیں کروں گی بھابھی۔“ پہلی بار اس نے اعلان کیا۔

”تیرے بھائی کو کون سمجھائے۔“
فرقان نے ایک رشتہ ڈھونڈ نکالا۔ عاصی کی عمر زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔ اب رشتے ملنے میں بہت مشکل ہوتی تھی۔

عاصی کو ہسٹریائی دورے پڑنے لگے، کہتی جاتی۔
”مجھے شادی نہیں کرنی۔ مجھے بچالو۔ مجھے بچالو۔“

بچا تا کون۔ جسے بچانا تھا وہ تو ڈوب رہا تھا۔
فرقان بہت پریشان رہنے لگا۔
”کیا ہوا ہے عاصی کو۔ یہ کیوں کرتی ہے ایسے؟“
”پتا نہیں کیا الٹا سیدھا سوچتی رہتی ہے۔ کوئی آپ کا چچا کا بیٹا تھا۔ اس کی شادی ہو گئی تو کہتی ہے اسے پسند کرتی تھی۔“

”وہ تو چھوٹا تھا عاصی سے۔ لیکن اگر تمہیں بتا دیتی تو میں چچا سے بات کر لیتا۔ اب تو اس کی شادی ہو گئی ہے۔“

”شاید اسی کا روگ پال لیا ہے عاصی نے۔“
”پر شادی تو کرنی ہے نا عاصی کی۔ ویسے ہی اتنی عمر ہو گئی۔“

جب جب کوئی رشتہ آتا، عاصی کو دورے پڑنے لگتے۔ اس کی حالت اور سے اور بگڑنے لگی۔ عافیہ

”کسی لڑکے کے ساتھ چکر تھار کی کا؟“
”چکر دکر کچھ نہیں تھا۔ پانچ وقت کی نمازی تھی تمہاری طرح۔ دنیا کا پاک باز سے پاک باز مرد بھی شک سے پاک نہیں ہونا عاصی۔ اپنے بھائی کو ہی دیکھ لو۔ جب فون کرتا ہے، ہزار ہزار سوال پوچھتا ہے۔ کیا میں نہیں جانتی۔ شک کرتا ہے مجھ پر۔ کہاں گئی تھیں۔ کس کے ساتھ تھیں۔ اور اپنے بھائی سے ذکر نہ کرنا۔ مجھے بہت گندی گندی گالیاں دیتا ہے۔ بہت دل دکھتا ہے میرا۔ کاش میں نے شادی نہ کی ہوتی۔ اندر سے نو مرچکی ہوں میں۔“

عاصی فون پر بھی اپنے بھائی سے بات کرنے سے کترانے لگی۔

”بھائی کا فون آیا ہے۔ تجھے بلا رہا ہے، بات کر لے۔“ سنتے ہی اس کا رنگ سیاہ ہو جاتا۔ فرقان اتنی باتیں کرتا رہتا اور وہ ہوں ہاں کر کے بھاگنے کی کرتی۔ وہ کہہ کر یہی خیال سنا کہ اس کا بھائی ایسا گندا ہے کہ عافیہ جیسی نمازی بیوی کو گالیاں دیتا ہے۔ نمازی بھابھی نت نئے قصے، کہانیاں اسے سناتی رہتی۔ وہ رات رات بھر نہ سو سکتی۔

”میری دور کی ایک خالہ ہیں۔ ان کی بیٹی کو اس کے شوہر نے جلا ڈالا تو بہ! بڑا کھرام مچا تھا عاصی۔ کسی چھوٹی سی بات پر میاں بیوی میں جھگڑا ہو گیا۔ اور اس نے دوپٹے کے بل دے کر پہلے اس کا گلا دیا۔ جب مر گئی تو تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ بس کچھ نہ پوچھو۔ عاصی! میں تو دہل گئی۔ بس دعا کرتی ہوں میری کبھی شادی نہ ہو، اگر میری کوئی بیٹی ہوتی تو قسم سے بھی اس کی شادی نہ کرتی، مرجاتی اسے اس عذاب میں نہ ڈالتی۔“

اس عذاب میں پھر عاصی بھی کیوں جاتی۔
فرقان آیا، پھر سے عاصی کے رشتے کے لیے دوڑ

کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس بھی بھیجا۔ عافیہ ڈاکٹر کو اپنی من پسند کہانیاں سن کر دوالے آئی۔ عاصروہ دوا کھاتی رہی۔

ساتھ ساتھ چھوٹے موٹے قصے، کہانیاں عافیہ اس کے گوش گزار کرتی رہی، کچھ اس لیے بھی زیادہ کہ وہ پیسے بننے کے۔ سات سال بعد پھر سے ماں بنی تھی۔ فیروزہ کی ماں۔ عافیہ نے فیروزہ کو عاصروہ کی گود میں دیا۔ ”آج سے یہ تمہاری ہے۔“

عاصروہ نے آج تک لڑکے ہی پالے تھے اور وقت گزرنے کے ساتھ مردوں سے اس کا دل برا ہونے لگا تو وہ جازب، حماد، احمد سے بھی دور ہونے لگی۔ اس کے ذہن میں یہی خیال آتا کہ ہیں تو یہ بھی مستقبل کے شوہر ہی ناں۔ عورت کو جوتی کی نوک پر رکھنے والے۔ پہلی بار لڑکی ملی تو وہ جیسے مکمل سی ہو گئی۔ اسے اپنی ہم جنسوں سے ہی محبت تھی۔ فیروزہ کے لیے اس کی محبت جنون کی حد تک بڑھنے لگی۔

فرقان قطر میں کسی کو دیکھ کر پسند کر چکا تھا۔ رشتہ بھی پکا کر چکا تھا۔ ”فرقان نے پھر سے اپنے جیسے کسی شکی کو تمہارے لیے پسند کر لیا ہے۔“

”آپ ان سے کہتیں کیوں نہیں کہ مجھے شادی نہیں کرنی۔“

”میں تو یہی چاہتی ہوں۔ یہ گھر ہے۔ کتنا سکون ہے یہاں۔ نہ کوئی مارنے والا، نہ گالیاں دینے والا، نہ کوئی ذلیل کرنے والا۔ فیروزہ تمہارے پاس ہے۔ اچھا کھاتی ہو، پہنتی ہو۔ شوہر کی مار تو نہیں کھانی پڑتی ناں۔ لیکن تمہارے بھائی کو تمہارا سکون پیارا نہیں ہے۔“

”بس بھائی سے کہہ دیں بھابھی! مجھے شادی نہیں کرنی۔“ وہ اس کو مولود بچے کی نظر آنے لگتی جو آسمان پر بجلی کی چمک دیکھ کر سہم کر گئی تھی گھٹے روتا رہتا ہے۔ چلی پھر چمکتی ہے، وہ پھر سے روتا ہے، کوئی اختیار ہی نہیں۔

”تم خود کہہ دو اپنے بھائی سے۔“

”مجھے بھائی سے ڈر لگتا ہے بھابھی۔“

”ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ شادی ہو گئی تو روز ڈرو گی۔ ہمت کرو۔ پھر نہ کہنا مجھے۔ سمجھا رہی ہوں اب۔“

جب کبھی کوئی ملنے جلنے والا اس کی شادی کی بات کرتا اس کا سارا خون جیسے نچر سا جاتا۔ سر چکراتے لگتا۔ اس کا دل دھاڑیں مار مار کر رونے کو چاہتا۔ سوچ سوچ کر وہ ڈھانچہ بننے لگی۔ باہر بیٹھا فرقان الگ پریشان تھا جو چھ مہینے بعد آتا تھا وہ پہلے ہی اگیا۔

بالا ہی بالا سب تیار ہاں کرنے لگا۔ شادی کی تاریخ رکھ دی اور نکاح سے تھیک ایک ہفتہ پہلے اس نے چوہے مار گولیاں کھالیں۔ فرقان دم بخود رہ گیا۔ یہ کیا ہو گیا۔ اسپتال میں پاگلوں کی طرح ادھر ادھر بھاگتا رہا۔

اس کی جان بچ گئی۔

اس کی شادی ٹوٹ گئی۔

اس کی عمر بڑھتی گئی۔ وہ فیروزہ کی ماں جانی بن گئی۔ اگر تخلیق سے عورت کی تکمیل ہوتی ہے تو اس نے اپنی تکمیل فیروزہ سے کر لی۔

عاصروہ فرقان کی اکلوتی بہن ایک اکلوتی ہی رہ گئی۔

☆☆☆

عافیہ فیروزہ کی اکلوتی ماما عیش پسندی میں گھر گئی۔ عاصروہ کی مامی آوازیں کائنات سے گواہوں کے گواہ اٹھا کر لا رہی ہیں۔

”یہ کیا ہو گیا؟“ وہ پوچھ رہی ہیں۔

”یہ جواب ہے۔“ وہ بتا رہی ہیں۔

”یہ کیسا عذاب ہے؟“ وہ ذلیل مانگ رہی ہیں۔

”کس نے کہا یہ عذاب ہے۔ یہ تو بھگتن ہے۔“

فیروزہ نے ایک بھی آواز کا جواب نہیں دیا۔ اس نے ایک بار بھی آنکھیں کھول کر دنیا کی رہنمائی کو نہیں دیکھا۔ فی الحال وہ آنکھیں موندے پڑی ہے۔

فرقان نے باہر بہت کما لیا۔ عافیہ نے نیا بنگلہ لے

لیا۔ چوکیدار اور ڈرائیور بھی آگئے۔ دو کام والیاں بھی۔ لیکن فیروزہ کی دیکھ بھال عاصہ نے ہی کی۔ عافیہ کے پرس میں پیسوں کی جگہ کریڈٹ کارڈز نے لے لی۔

فیروزہ اسکول آتی جاتی، سوتی جاتی، کھاتی، کھیلتی، صرف اپنی اماں جانی کے ساتھ۔ اماں جانی اس کے منہ میں نوالے بنا بنا کر رکھتی۔ ایک اسے کھلاتی، ایک خود کھاتی۔

دونوں ایک دوسرے کا دم چھلا بن گئیں۔

عاصہ کہتی ”سو جاؤ فیروزہ۔!“ فیروزہ اگلا سوال نہ کرتی اور جھٹ آنکھیں بند کر لیتی۔ اب قیامت آئے یا طوفان۔ یہ آنکھیں اماں جانی کے کہنے پر ہی کھلیں گی۔

عاصہ کہتی ”فیروزہ! تمہیں کلاس میں فرسٹ آنا ہے۔“ فیروزہ اس وقت تک اپنے ٹیوٹر کی جان نہ چھوڑتی جب تک فرسٹ آنے جتنا پڑھ نہ لیتی۔

عاصہ اسے اسکول چھوڑنے جاتی، اسکول سے لے کر آتی اور رات کو نہ جانے کون کون سی کہانیاں سنا کر سلاوتی۔

لوگ کہتے ”فیروزہ تو عاصہ کی بیٹی ہے“ خود فیروزہ یہی کہتی۔ عافیہ کو اس سے فرق نہیں پڑتا کہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ اس نے ایک آرام دہ سہل۔ اپنی مرضی کی زندگی گزاری تھی۔ اسے کوئی ذمہ داری اٹھانی نہیں پڑی تھی کبھی۔ وہ خود کو خوش قسمت سمجھتی تھی۔ اس نے اپنی بہنوں اور دوستوں کو بھی یہی مشورے دیے تھے کہ اپنی نندوں کو اپنی مٹھی میں کرو اور گھرانے کے سپرد کر دیں۔ لیکن وہ اس کی طرح اتنی کامیاب نہیں ہو سکی تھیں، ایک تو ان نندوں کی مائیں حیات تھیں، دوسرا وہ عاصہ جیسی نہیں تھیں جس کے لیے ایک بھابی ہی ”سچو“ تھی بس۔

تو چاروں بچے عافیہ کے ہی تھے۔ لیکن انہیں پال عاصہ نے دیا تھا۔ بیٹے اسے پھوپھو جانی کہتے۔ بیٹی اماں جانی۔ کیا فرق پڑتا تھا۔ بڑا بھی تو وہ صرف فرق نہ رہا۔ کبھی کبھی عافیہ تھوڑا سا چڑ جاتی، جب فیروزہ ہر وقت

عاصہ کے ساتھ ہی چمکی رہتی۔ خاندان کی تقریب، شادی بیاہ میں پہلے تو وہ جاتی ہی نہ تھیں، لیکن عاصہ کے ساتھ چمکی رہتی۔

عاصہ دلہن کے پاس جائے گی تو ہی فیروزہ ہراساں کی۔

عاصہ پھولوں کی پلیٹ لے کر استقبال کے لیے کھڑی ہوگی تو ہی وہ کھڑی ہوگی۔

گی تو ہی وہ لپ اسٹک لگائے گی، بال کھولے گی۔ اگر وہ عاصہ کی ساری باتیں مانتی تھی تو عام ہوگی اس کی مانگی تھی۔ دونوں سوال اندر جواب تھیں۔

دوسرے کے لیے۔ فیروزہ اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ تو تھوڑا بہت کھل مل جاتی، لیکن ہم عمر کرن لڑکیوں سے بالکل نہیں۔

عافیہ اسے اچھے کالج میں داخل کروانا چاہتی تھی۔ لیکن فیروزہ نے داخلہ نہ لیا۔ کالج کو انجوائے میں لے کر اپنے بھائیوں سے بھی دور بھاگتی، ہر وقت ان سے چہرہ رہتی۔

”تم ہو ہی ایسے۔“ اکثر وہ ان پر طنز کرتی۔

جاذب پڑھنے کے لیے باہر چلا گیا۔ حماد بھی پیچھے چلا گیا۔ احمد سے بات کرنا فیروزہ پسند نہ کرتی نہ اسے پروا ہوتی کہ جاذب اور حماد اسے فون کیوں نہیں کرتے۔ یا وہ اتنے سالوں سے گھر کیوں نہیں آئے۔

یہ سب باتیں عافیہ نے بہت دیر میں محسوس کیں۔ جب۔ جب۔

اس کی بہن نے اپنے بیٹے کے لیے فیروزہ کا ہاں مانگا۔ وہ گھر آئی۔ مٹھائی لائی اور باقاعدہ رشتہ بن گئی۔ سالوں سے دونوں بہنوں نے یہی طے کر رکھا تھا۔

سالوں پہلے جو طے کیا تھا۔ سالوں بعد وہ ہونے لگی۔ مٹھائی کے ٹوکے اٹھا کر فیروزہ نے باہر بھیج دیے۔ ایک دھماکا ہوا۔ ایک دور لوٹ کر واپس آیا۔ اختتامیہ ڈرامے کے پردے اٹھائے گئے۔

ابھی شوباتی تھا۔

”مجھے شادی نہیں کرنی۔“ فیروزہ نے حلق کے بل چلا کر کہا۔

آتش فشانی دھماکوں کی ساری کی ساری آوازیں کسی نے عافیہ کے کانوں کے آریار کر دیں۔ وہ فیروزہ کو دیکھتی ہی رہ گئی۔ اتنی بڑی غلطی اس سے کیسے ہو گئی۔

الف اللہ عاصروہ نے اسے سکھایا تھا۔

”مرد برا“ عاصروہ اسے یہ کیسے نہ سکھاتی؟ وہ عاصروہ کی استاد بنی تھی۔ عاصروہ فیروزہ کی استاد کیونکر نہ بنتی۔ کیونکر نہ؟

عافیہ کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ وہ فیروزہ کو اپنے ساتھ سلاتی، لیکن یونیورسٹی جانے والی لڑکی اب گہلی مٹی نہیں تھی۔ جس پر ایک انگلی سے کچھ بھی لکھ کر مٹا دیا جاتا۔ وہ تو سہ وہ تو سہ۔ اب وہ پتھروں چکی تھی جسے گھر کی محراب کی پیشانی پر لگا دیا جاتا۔ یا قبر کے سرہانے پر۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ نئے دور کی لڑکی۔ اخبارات، ٹی وی، انٹرنیٹ کے ذریعے دنیا بھر میں ہونے والے مظالم کی زیادہ جانکاری رکھتی تھی۔ اسے سب معلوم تھا کہ ہر سال کتنی عورتیں شوہروں کے مظالم کے ہاتھوں مرجاتی ہیں یا نفسیاتی مریض بن جاتی ہیں۔ مرد کیسے کیسے عورت کو ٹریٹ کرتا ہے اسے سب معلوم تھا۔

اور خاص کر اس کی اماں جانی نے شادی نہیں کی تھی تو وہ کیوں کرتی۔

سوچ سوچ کر عافیہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی۔ عاصروہ کے پاس جائے اس کے پاؤں پڑے کہ فیروزہ کو سمجھائے۔ یا فیروزہ پر سختی کرے۔ لیکن عاصروہ کے پاؤں وہ کس طرح پکڑے۔

”مرد برا“ سکھانے والی زبان۔

”مرد اچھا۔“ کیسے بتائے گی اب بہت دیر ہو گئی تھی۔ دیر کر دی تھی۔

اسے اس کا ایک ہی حل نظر آیا۔ اپنی بہن کو عافیہ نے ہاں کہہ دی اور دو دن کے اندر اندر نکاح کے لیے بلوالیا۔ وہ بڑی خاموشی اور راز داری سے یہ سب

کر رہی تھی۔ فرقان کو بھی سو جھوٹ بچ کہہ کر خاموش رہنے کے لیے کہا تھا اور نکاح سے دو دن پہلے رات کو فیروزہ نے احمد اور عافیہ کی باتیں سن لیں۔ جو وہ نکاح کی تیاری کے سلسلے میں کر رہے تھے۔

اسے یہ سب بھی بعد میں پتا چلا۔ نکاح والے دن صبح سویرے جب وہ ابھی ملازم نے کہا۔

”کچن میں تو کہیں چوہے نہیں ہیں، بانی گھر میں بھی کہیں نہیں دیکھے۔ آپ نے دوائی کیوں منگوائی۔“ چوکیدار کہہ رہا تھا کہ وہ بتانا بھول گیا کہ اسٹور والے نے کہا تھا کہ جہاں دوا رکھو وہاں سے ٹھیک چوبیس گھنٹے بعد اٹھا ضرور لینی ہے۔

رات کے کھانے کے بعد ملازم اس کے پاس آیا۔ ”کون سی دوا؟“ اس نے مصروف انداز میں پوچھا۔ ”چوہے مار دوا۔“ جو آپ نے منگوائی تھی کمروں کے لیے۔

آدھی رات کو اسے یاد آیا کہ چوہے والی دوا، چوکیدار، ملازم۔ یہ سب کیا تھا۔ کیا تھا۔ وہ اپنے کمرے سے عاصروہ کے کمرے کی طرف بھاگی۔ ”فیروزہ کہاں ہے؟“ آج کل فیروزہ اسی کے ساتھ سو رہی تھی۔

”فیروزہ۔“ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ گیارہ بجے تک تو میرے ساتھ ہی سوئی رہی۔ پھر۔“

”فیروزہ!“ عافیہ نے وہیں کھڑے کھڑے چیخ ماری۔ عاصروہ نے عافیہ کی شکل دیکھی اور انجانے پن سے ہی سہم کر اٹھ کر فیروزہ کے کمرے کی طرف بھاگی۔ عاصروہ کی دوڑ عافیہ کی دوڑ سے کہیں زیادہ تھی۔ عاصروہ نے فیروزہ کے کمرے کے دروازے کو دھکا دیا۔

اس دھکے سے عافیہ ڈھیر ہو گئی۔ خاک بوس ہو گئی۔ عاصروہ کی چیخوں سے فرقان، احمد، ملازم سب آگئے تھے۔ فیروزہ کو اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ عافیہ وہیں ڈھیر بنی پڑی تھی۔ وہ جان چکی تھی، ہونی ہو چکی تھی، موت کا پرندہ زندگی لے اڑا ہے۔ سودا گھائے میں گیا ہے۔ بہت گھائے میں۔